بینش فاطمہ

لیکچرار شعبہ اردو وفاقی اردو یونیورسٹی برائے فنون، سائنس و ٹیکنالوجی, اسلام آباد

مابعد جدیدیت اور تانیثیت کے مباحث

Beenish Fatima

Lecturer Urdu , Federal Urdu University of Arts,Science &Technology, Islamabad.

Disscussions of Postmodernism & Feminism

Postmodernism is a broad movement that developed in the late 20th century across the different fields of life e.g arts, Philosophy, architecture and criticism. It is an intellectual stance or a mode of discourse that rejects the possibility of reliable knowledge. Feminism is a range of different political movements, ideologies and social movements that share a common goal: to define, establish and achieve the political, economic, personal and social equality of genders. This research article comprises of basic and ideological discourse on post modernism and feminism in Urdu literature. In this article the evolution of feministic theory has been observed, keeping in view the philosophical discourse shaped on universal level and the historical perspective of women.In addition ,a brief review of another important post modern theory New Historicism has also been stated in this article.

مابعد جدید نظریہ سازوں کی فکر کو فارمولا سازی کے انداز میں ڈھالنا مشکل ہی نہیں بلکہ یہ مابعد جدیدیت کی روح کے بھی خلاف ہے۔ مابعد جدیدیت ایک تکثیری صورتِ حال اور نظریات کا مجموعہ ہے جو واحدانیت، مرکزیت اور مثالیت پسندی کے خلاف ہے۔ یہ تمام کلیوں اور روایتی فارمولوں کو جبر تصور کرتے ہوئے رد کر دیتی ہے۔ اس صورتِ حال کے باوجود مختلف مفکرین کے ہاں چند فکری مماثلتیں پائی جاتی ہیں جن کو مابعد جدیدیت کے منی بیانیے کہا جاسکتا ہے۔ مابعد جدیدیت کسی بھی نظریے، فلسفے اور عقیدے کی آفاقیت کو تسلیم نہیں کرتی۔ کوئی بھی نظریہ و فلسفہ اپنے مخصوص عہد اور ثقافت کا ترجمان ہوتا ہے اس کو آفاقی بنا کر مسلط نہیں کیا جاسکتا۔ آفاقیت کے دعوے میں دراصل اجارہ داری کی خواہش پوشیدہ ہوتی ہے۔ استبدادی رویے اور

اجارہ داری تخلیقیت کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ یہ انسانی ذہن پر یوٹو پیائی تصورات مسلط کر کے اسے آزادانہ پرواز سے روکتے ہیں۔ ذہنی آزادی ہی اعلیٰ قسم کا ادب تخلیق کر سکتی ہے۔ اس لیے کسی بھی نظریے کو حتمی مان کر پائوں کی زنجیر نہیں بنانا چاہیے۔ مابعد جدیدیت نام نہاد سچائیوں کو بھی تسلیم نہیں کرتی کیوں کہ یہ سچائیاں ہمیشہ مرکز کی تشکیل کی راجع ہوتی ہیں جس کی بدولت کئی چھوٹی چھوٹی سچائیاں مرکزیت کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتی ہیں۔ مابعد جدید مفکرین سچائیوں کو بھی ایک عہد اور ثقافت کی پیداوار سمجھتے ہیں اور ان کو آفاقی رنگ دینے سے احتراز کرتے ہیں۔

مابعد جدیدیت جس طرح یوٹوپیائی تصورات، سچائی کی آفاقیت کی نفی کرتی ہے بالکل اسی طرح یہ معنی کی حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کرتی۔ اس کے نزدیک معنی سماجی تشکیلات کا حصہ ہیں۔ ہر فرد یعنی قاری کا ذہن اپنے سماج کی مخصوص Apste-Me کے زیر اثر تشکیل پاتا ہے۔ متن اور قاری کے رابطے سے ایک نئی معنوی فضا جنم لیتی ہے۔ معنی کی عدم حتمیت تحریر کا قبح نہیں بلکہ حسن ہے اس طرح متن مصنف کی حدود سے نکل جاتا ہے، دنیا اور متن کی تعبیر اپنے اپنے طریقوں سے ممکن ہے۔ کسی ایک تعبیر کی حتمیت دراصل ذہنی و فکری بندش سے مماثل ہے۔ عقل اور سائنس کو غیر جانب دار علوم کا نام دیا گیا تھا لیکن مابعد جدیدیت کے بقول کوئی بھی علم حقیقی طور پر غیر جانب دار نہیں ہوتا۔ سائنس اجارہ داری کا ایک آلہ بن چکی ہے اور عقل ایک مخصوص Apste-Me کی پیداوار ہوتی ہے جس کے نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ مابعد جدیدیت ہیگل کے اس تصور تاریخ کے بھی خلاف ہے جس کے مطابق تاریخ ہمیشہ آگے کی طرف سفر کرتی ہے یا آنے والا ہر لمحہ ترقی کی طرف ایک قدم آگے ہوتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آنے والا ہر لمحہ لازمی طور پر ترقی کی طرف ہو۔ مابعد جدیدیت تاریخ میں عدم تسلسل پر یقین رکھتی ہے۔ یہ تمام فکری مباحث اس بات کی دلیل ہیں کہ مابعد جدیدیت دراصل، جدیدیت کے بعد تشکیل پانے والی صورتِ حال کا نام ہے۔ ہمہ قسم کے علوم وفنون اور ثقافتیں اس کے دائرہ اثر میں ہیں۔ مابعد جدیدیت کی بنیاد تکثیریت، مقامیت، غیر حتمیت، لامرکزیت، آزادانہ تخلیقی فضا، معنی کی کثرت، اتھارٹی کے زوال جیسے مکالموں پر قائم ہے۔

مابعد جدیدیت کسی ایک تھیوری یا نظریے کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ یہ مختلف نظریات کے مجموعہ کا نام ہے۔ یہ تھیوریز مختلف ہوتے ہوئے بھی مابعد جدیدیت سے گہرا علاقہ رکھتی ہیں۔ ردِ تشکیل، بین المتونیت، نو تاریخیت اور تانیثیت (Feminism) مابعد جدید فکر کی نمائندہ تھیوریز ہیں۔ یہ سارے نظریات جدیدیت کے بعد پروان چڑھے اس لیے مابعد جدید فکر کا حصہ کہلائے۔ اس سے قبل جدیدیت (Modernism) میں

تمام خیالات و نظریات کا مرکز انسان تھا۔ دورِ جدید کے اختتام پر جب یہ مرکزیت ختم ہوئی تو ذیلی عناصر کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔ انسان کے علاوہ جتنے موضوعات تھے وہ فکر و فلسفے کا مرکز ٹھہرے۔ اب تک فکر و نظر، تاریخ و فلسفہ اور ادب کا مرکز جو انسان تھا وہ بنیادی طور پر مرد ہی تھا۔ دورِ جدید میں انسان اساسِ کائنات کی صفیں جب لپیٹی گئیں تو ان صفوں کے نیچے پسے ہوئے کئی طبقات اُبھر کر سامنے آئے۔ خواتین انہی استحصالی طبقات میں سے ایک تھیں۔ وہ مخصوص مردانہ ذہنیت سے تشکیل پانے والی ثقافتی سچائیوں میں جینے پر مجبور تھیں۔ مابعد جدیدیت چونکہ عدم مرکزیت کی قائل ہے اور وہ اشرافیہ کی بجائے "Subaltern" کو زیادہ اہمیت دیتی ہے اس لیے انسان، کائنات، فطرت، ثقافت اور عورت کے رشتوں پر از سر نو غور کیا گیا۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ تانیثیت کے بہت سے عناصر مابعد جدید فکر کا شاخسانہ ہیں۔

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اپنے مضمون ''مابعد جدیدیت کچھ روشن زاویے'' میں مابعد جدیدیت کے عناصر کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔ مگر ضمنی طور پر انہوں نے مابعد جدیدیت اور تانیثیت کے باہمی تعلق کی وضاحت بھی کر دی ہے:

''پچھلے بیس تیس برسوں میں انسانی سوچ میں اتنی تبدیلیاں ہوئی ہیں کہ پہلے سے موجود بہت سی چیزوں پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے۔ بہت سی معمولہ حقیقتیں جو انسان کی اصلاح و فلاح کی ضامن سمجھی جاتی تھیں اب شک کی نظروں سے دیکھی جانے لگی ہیں۔ تاریخ کا سفر ترقی کی راہ میں ہے یا نہیں، انسانیت کا مستقبل، ذات کی مرکزیت یعنی کشاکش، زبان کی اسراریت، ادب کی نوعیت وماہیت، متن کی خود کفالت، قاری کی فعالیت، ان سب سوالوں کی طرفیں کھل گئی ہیں اور یہ سب بحثیں مابعد جدید منظر نامے کا حصہ ہیں نیز بہت سے دوشاخے رشتوں کی تفریقیت اور ان کی فوقیتی ترتیب پر سوالیہ نشان لگ چکا ہے۔ حاشیہ / مرکز، لاشعور / شعور، خود / غیر خود، حاضر معنی / غائب معنی کی Hierarchies کا ٹوٹنا، یہ چیلنج بنیادی طور پر رد تشکیلی ہے جیسا کہ نسوانیت کی تحریر یا دلت ساہتیہ میں ملتا ہے یا دیسی واد یا پوسٹ کولونیل ازم جو آزادی کے بعد جڑوں پر اصرار سے عبارت ہیں یا کولونیل اثرات کو Decolonise کرنے کے خواہاں ہیں۔ سب اسی فکر کے مختلف زاویے ہیں۔''(۱)

مابعد جدیدیت چونکہ متعینہ اقدار پر ضرب کاری کرتی ہے اس لیے اس نے پدر سری اقدار کی بھی رد تشکیل کا مطالبہ کیا۔ اس کے علاوہ وہ سچائیاں جو ماضی میں حاشیوں اور کناروں پر تھی، مابعد جدیدیت ایسی سچائیوں کو مرکزی اہمیت دیتی ہے۔ عورت چونکہ ماضی میں مرکز کی بجائے حاشیہ پر رہی ہے تو مابعد جدیدیت نے تاریخ کے حاشیوں پر لکھی جانے والی اس سچائی کو بھی اہمیت دی۔ یوں تانیثیت مابعد جدیدیت کی ذیلی

تھیوری بنتی ہے کچھ تانیثی مفکرین نے تانیثیت اور مابعد جدیدیت کے تعلق کو اس لیے ہدفِ تنقید ٹھہرایا ہے کیوں کہ مابعد جدیدیت کے نظریہ سازوں میں بڑی تعداد مردوں کی ہے اور ان کے ترتیب دیے گئے فکری ماڈل بھی مردانہ اقدار کے عکاس ہیں کیوں کہ طویل عرصے کے تاریخی جبر نے مردوں کے لاشعور کو بھی متاثر کر رکھا ہے اس لیے ان کا کوئی بھی نظریہ مردانہ تعصب سے پاک نہیں ہو سکتا۔ ناصر عباس نیر مابعد جدیدیت اور تانیثیت کے تعلق کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"مابعد جدیدیت لامرکزیت کی قائل ہے، نسوانی تنقید بھی مردانہ فکر اور مرد کی سماجی حیثیت کو مرکزی قرار دینے کے خلاف ہے۔ مابعد جدیدیت آفاقیت کی بجائے مقامیت پر زور دیتی ہے، نسوانی تنقید بھی تاریخی، ثقافتی اور ادبی اصولوں کی آفاقیت پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ اسی طرح مابعد جدیدیت میں دریدا اور فوکو کی فکر کے زیر اثر جو طبقات اور فکری روشیں حاشیے پر تھیں وہ بھی ڈسکورس میں شامل ہو گئیں۔ نسوانیت کا موضوع بھی حاشیے پر تھا جسے تنقیدی ڈسکورس میں نمایاں مقام ملا ہے۔" (۲)

یہ بات واضح ہے کہ تانیثیت کے بہت سے فکری زاویوں نے مابعد جدیدیت کی جڑوں سے نمو پائی ہے لیکن تانیثی تھیوری کو صرف مابعد جدیدیت کے دائرے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بہت سے فکری رویوں میں مابعد جدیدیت کے دائرے سے نکلتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مابعد جدیدیت تمام تر مہابیانیوں کا انکار کرتی ہے اور وہ کسی طرح کی یک نوعی صداقتوں کو بھی تسلیم نہیں کرتی جب کہ تانیثیت ایک مخصوص نقطۂ نظر کی صداقت کی علمبردار ہے۔ یہیں تانیثیت (Feminism) کی سماجی تحریک مابعد جدید فکر سے علاحدہ ہو جاتی ہے۔ "Feminism" ایک ایسی تھیوری ہے جس کا براہ راست تعلق خواتین سے ہے۔ اس کا ترجمہ بعض اُردو مترجمین اور ناقدین نے نسائیت اور بعض نے تانیثیت کیا ہے۔ تانیثیت، نسائیت کی نسبت ایک زیادہ جامع اصطلاح ہے اور کسی حد تک اُردو ادب میں رائج ہو چکی ہے۔ تانیثیت میں خواتین کے حقوق کے علاوہ نسائی حسیت، شعورِ ذات اور فلسفیانہ ادراک کے مفاہیم بھی شامل ہیں۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں لفظ Feminism کی وضاحت کچھ یوں ہے:

"The opinions and principles of the advocates of the extended recognition of the achievements and claim of women's advocacy of women's rights ."(3)

Maggie Humm اپنی کتاب "The Dictionary of Feminist Theory" میں لکھتی ہیں:

"Feminism is a discourse that involves various movements, theories and philosophies which are concerned with the issue of gender difference, advocate equality for women, and campaigned for women's rights and interests."(4)

تانیثیت ایک وسیع المعانی تھیوری ہے جس میں خواتین کے مختلف مسائل اور رویوں کو موضوع بنایا گیاہے۔ ذکوری اقدار کے حامل معاشرے میں خواتین کے معاشی استحصال جنسی جبر، دہشت انگیزی، سماجی ناہمواریاں، غیر مساویانہ حقوق، قانونی عدم تحفظ اور فرسودہ خاندانی رشتوں کے مرکز میں تشخص کی تلاش تانیثیت کا سب سے اہم حوالہ ہے۔ تانیثی شعور عورت ذات کا ہمہ جہتی فلسفیانہ ادراک ہے جس میں عورت کے جسمانی وجود سے لے کر فطری، نفسیاتی اور ثقافتی پہلو شامل ہیں۔اس ادراک کی ابتدائی سطح یہ ہے کہ آج کے معاشرے میں بھی عورتوں کے ساتھ امتیازی سلوک کیا جاتا ہے اور اس طرح کے رویے کو بدلنے کی کوشش فیمینزم کا حصہ ہے۔

تانیثیت کی صحیح تفہیم تاریخ میں عورت کی سماجی حیثیت اور حقوقِ نسواں کی تحریک کے پس منظر میں ہی ممکن ہے کیوں کہ یہ وہ عوامل ہیں جنھوں نے تانیثیت جیسی سماجی اور فلسفیانہ تحریک کو جنم دیا۔ عورت اگرچہ کائنات کا ایک اہم اور بنیادی کردار ہے لیکن پدرسری معاشرے نے اسے ہمیشہ کمزور، محکوم، مرد کی معاون، مفعول و معروض اور کم تر درجے کی مخلوق کا رتبہ عطا کیا۔ انہی امتیازات کی بدولت ادبی و سماجی تاریخوں کے صفحات عورت کے ذکر سے خالی نظر آتے ہیں۔

طویل سماجی تاریخ میں عورت کی عدم موجودگی مرد اغلب فکر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اگر تاریخ اور سماجی اقدار کی ردِ تشکیل کی جائے تو اس سے عورت کی محرومیوں کی نئی دستاویز ترتیب پائے گی۔ عورت نے معاشرتی ارتقاء میں ہمیشہ اپنی ذمہ داریوں کو نبھایا لیکن سارے کارناموں کا سہرا ہمیشہ مردوں کے سر جاتا رہا۔ وہ تہذیبی ارتقاء میں سماج کا ایندھن بنتی رہی لیکن تاریخ کے صفحات پر مردوں کے نام سنہری حروف میں لکھے جاتے رہے۔

ماہرین کی تحقیق اور آثار قدیمہ کی دریافتوں سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کہ پدر سری سماج سے پہلے کائنات میں مادری نظام موجود تھا۔ عورت کو اس نظام میں مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ وہ قبیلے کی سردار تھی۔ اسی کے نام سے نسب کا سلسلہ چلتا تھا۔ تمام سماجی امور میں اس کا حکم آخری سمجھا جاتا تھا۔ وہ شوہر کے ترک و انتخاب کے فیصلے میں یکسر آزاد تھی۔مادری نظام کے اس مذکورہ عہد میں مرد عورت سے ہر طرح مرعوب نظر آتا ہے۔ افزائش نسل کی تانیثی خوبی نے عورت کو تخلیق کی دیوی بنادیا۔ مرد تخلیق کے عمل میں جب تک اپنے کردار سے آگاہ نہ تھا اس وقت تک وہ عورت کو محیر العقول جانتے ہوئے اس کی پوجا کرتا رہا، دیویوں کی تصویریں، مورتیاں اور اساطیری روایات اس عہد کی یادگار ہیں۔

"یہ دیوی مختلف تہذیبوں میں مختلف ناموں سے پکاری جاتی رہی۔ سومیریوں نے اس دیوی کو 'انانا'، بابلیوں نے 'عشتار'، سامیوں میں 'عستارات'، مصر میں 'آئسس'، چین میں 'شین شین' ایران میں 'اناہتا'، آریائوں میں 'اوشا' اور یونان میں 'افرودیتی' کے مختلف ناموں سے پکارا۔"(۵)

اس عہد میں جب عورت کی بطور دیوی علامتی پوجا کی جارہی تھی عمومی معاشرتی نظام میں بھی اس کا مقام و مرتبہ بلند تھا۔ قدرت کے زیادہ تر وسائل عورت کے زیرِ تصرف تھے۔ مرد عمومی طور پر گلہ بانی کرتے یا پھر شکار جب کہ عورت کھیتی باڑی کرتی، اناج جمع کرتی، بچوں کی پرورش کرتی اور کھالوں سے لباس تیار کرتی۔ اسی نسبت سے اولاد اور مال عورت کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ زرعی نظام کی ترقی نے اس فوقیتی ترتیب کو اُلٹ دیا۔ ہل اور دیگر زرعی آلات کی ایجاد نے نہ صرف مردوں کے تسلط کو مستحکم کیا بلکہ عورت کی خود مختاری کو بھی محدود کر دیا۔ معاشی نظام کے ساتھ ساتھ ملکیتی حقوق عورت سے آہستہ آہستہ مرد کو منتقل ہوتے گئے۔ یہ ایک تاریخی حقائق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ زرعی انقلاب نے عورت اس کے رتبے سے گرا دیا۔ پوری دنیا کی تہذیبیں اس سے متاثر ہوئیں۔ تبدیلی کا یہ عمل اگرچہ مختلف خطوں میں سست روی کا شکار رہا لیکن مجموعی اعتبار سے ایک خاص عرصے کے بعد پدر سری نظام غالب آگیا۔ عورت جو مالک تھی مملوک قرار پائی۔ مرد، باپ، بھائی، خاوند کے روپ میں اس کا مالک ٹھہرا۔ وہ ترکے کی دیگر اشیاء کی طرح خریدی اور بیچی جانے لگی۔ رسم الخط کی ایجاد کے بعد جب دنیا تحریر کے دور میں داخل ہوئی تو مردانہ غلبہ مکمل ہو چکا تھا۔

ہڑپائی تہذیب سے ملنے والے آثار کے مطابق ہندوستان میں بھی مادری نظام ایک عرصے تک موجود رہا۔ آریائوں کے ہاں بھی عورت کو بڑی تکریم حاصل تھی لیکن یہ صورتِ حال زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ کچھ عرصے بعد عورت کی سماجی حیثیت میں منفی تبدیلیاں واقع ہوئیں حتیٰ کہ عورت کو وید پڑھنے سے بھی

روک دیا گیا۔ عورت کو منحوس، بدکردار اور بد اخلاق سمجھا جانے لگا۔ عورت کی تحقیر کی اعلیٰ ترین شکل ستی جیسی رسم تھی۔ عورتوں کو زبردستی خاوند کی لاش کے ساتھ آگ کے سپرد کر دیا جاتا۔ برہمن ازم کے کٹر رویے نے ہر غلط رسم کو جو کسی وجہ سے بھی شروع ہوئی اسے مذہب اور قانون کا لبادہ پہنا دیا۔

ہندوستان کے ساتھ پوری دنیا میں عورت کی حالت دگرگوں ہوتی گئی۔ اس کی عزتِ نفس کو مجروح کیا جاتا رہا۔ مردانہ بالادستی کی تکمیل کی بدولت ذکوری اقدار نے مرد اور عورت کے شعور سے نکل کر لاشعور میں جگہ بنالی۔ مردانہ استحصالی رویوں نے حقوق کا درجہ حاصل کر لیا۔ عیسائیت کے زیر اثر سینٹ پال، سینٹ آگسٹائن، سینٹ تھامس، اکوئی ناس اور دوسری مذہبی شخصیات نے عورت کی تذلیل میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ چرچ نے ایک عرصہ تک عورت کو اپنے چنگل میں جکڑے رکھا اور اسے جادوگرنی قرار دے کر زندہ جلایا جاتا رہا۔ طویل عرصے کے جمود زدہ پدرسری نظام میں اسلام نے عورت کو تکریم عطا کی اور اس کو بنیادی حقوق کے ساتھ جائیداد میں وراثت کا حق بھی عطا کیا۔ اسلام میں طلاق و خلع کے قوانین کو واضح بنا کر عورت کو ازدواجی تحفظ فراہم کیا۔ ماں کے قدموں میں جنت کی بشارت دے کر اسے توقیر کے اعلیٰ مناصب پر فائز کیا۔ یہ اسلامی تعلیمات مختلف تہذیبوں کے مزاج کے مطابق کلی و جزوی طور پر اپنالی گئیں لیکن تہذیبی ادغام نے اسلامی تعلیمات پر بھی اپنی قباڈالنا شروع کر دی۔ جاگیر داری نظام نے عورت کے استحصال کے نئے نئے طریقے اپنا کر اسے معاشرتی نظام میں کسی حد تک محدود کر دیا۔ اس کے بعد ایک طویل عرصے تک عورت جمود زدگی کا شکار رہی۔

یورپ میں صنعتی انقلاب نے روایتی طرزِ زندگی کو بدل کر رکھ دیا۔ دنیا بھر کے معاشروں میں وسیع پیمانے پر ہونے والے اس سماجی تغیر کے نتیجے میں عورت کو بھی گھر سے باہر قدم رکھنے کے مواقع میسر آئے اور وہ صنعت و حرفت، ملازمت، تعلیم اور تجارت کے شعبوں میں آگے آنے لگی۔ نشاۃ الثانیہ کے عہد میں اراسمس اور تھامس مور جیسے مساویت پسند دانش وروں نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند کی اور ان کی تعلیم و تربیت پر زور دیا لیکن چرچ ایک دفعہ پھر آڑے آگیا۔ عورتوں نے برطانوی، امریکی اور فرانسیسی انقلاب میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ جب انقلاب کے ثمرات ملنا شروع ہوئے تو خواتین کو پس پشت ڈال دیا گیا۔ فرانس میں عورتوں کے ساتھ ہونے والے امتیازی سلوک کا اندازہ ہم اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ وہاں مختلف شعبوں میں مردوں کے برعکس خواتین کو ۵۰ فیصد تک کم اُجرت دی جاتی تھی۔ معاشی اور معاشرتی حقوق کے حصول کے لیے عورتوں کو بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ انقلابِ فرانس نے عورتوں کے حقوق کی جنگ کو ایک مہمیز عطا کی۔

عورتوں کے اندر اپنے حقوق کے حصول کا شعور پیدا ہوا۔ ۱۸۴۰ء میں لندن میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس نے بھی خواتین کی تحریک کو تقویت بخشی۔ یہ کانفرنس بنیادی طور پر غلامی کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے ترتیب دی گئی تھی۔(۶)

خواتین کو غلاموں کے مسائل اور اپنے مسائل میں کسی حد تک یکسانیت محسوس ہوئی تو انہوں نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے مربوط کوششوں کی ضرورت پر زور دیا۔ کرسٹین ڈی پیان، میری وولسٹن کرافٹ، جارج سینڈ اور دیگر لکھاری خواتین کی تحریروں نے عورتوں کو اپنے حقوق کے لیے مجتمع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

فرانس اگرچہ خواتین کی تحریک کا بڑا مرکز تھا لیکن وہاں انہیں کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل رہی تھی۔ فرانس کی نسبت امریکہ اور برطانیہ میں عورتوں کی آواز کو کسی حد تک سنا جا رہا تھا۔ انیس اور بیس جولائی ۱۸۴۸ء میں نیویارک میں حقوقِ نسواں سے متعلق کنونشن میں خواتین کے چند بنیادی حقوق کی قرار دادیں منظور کی گئیں تاکہ اربابِ اقتدار تک خواتین کی آواز پہنچائی جاسکے۔ اس کانوکیشن کے آخر میں یہ اعلامیہ جاری کیا گیا:

"We hold these truths to be self evident...that all men and women are created equal...The history of mankind is a history of repeated injuries and usurpation of man towards woman having indirect object the establishment of an absolute tyranny over her."(7)

مغرب میں انیسویں صدی کے اختتام تک حقوقِ نسواں کی زیادہ تر تحریکوں کی کوشش تھی کہ کسی طرح حق رائے دہی حاصل کرلیا جائے۔ اسی طرح عورت کے لیے جائیداد کے ملکیتی حقوق بھی مد نظر رکھے گے۔ اس بات کی سختی سے مخالفت کی گئی کہ عورت، عورت کی جائیداد اور بچے صرف اور صرف مرد کی ملکیت ہیں۔ برطانیہ میں اگرچہ ۱۸۷۰ء میں عورتوں کے حق رائے دہندگی کا بل جمع ہوا لیکن اس کی منظوری ۱۹۱۸ء میں ممکن ہوئی۔ اس بل کے مطابق ۳۰ سال کی تمام شادی شدہ خواتین کو ووٹ کا حق مل گیا۔ ۱۹۲۸ء میں خواتین ووٹر کی عمر ۳۰ سال سے کم کر کے ۱۸ سال کر دی گئی۔ ایسا ہی ایک بل ۱۸۷۲ء میں امریکی کانفرنس میں پیش کیا گیا جو مختلف وجوہ کی بنا پر رد ہوتا رہا۔ بالآخر ۱۹۲۰ء میں Anthony Amendment کے نام سے یہ ترمیم منظور کرلی گئی۔

حقوقِ نسواں کی تحریکیں امریکہ، فرانس اور برطانیہ میں زیادہ سرگرمِ عمل تھیں لیکن خواتین کو ووٹ کا حق سب سے پہلے ۱۸۹۳ء میں نیوزی لینڈ کی پارلیمنٹ نے دیا۔ اس مثال کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۰۲ء میں آسٹریلیا نے بھی خواتین کو رائے دہندگی کے حق سے نوازا۔

"عورتوں کے حقوق کی تحریک کو تقویت دینے کے لیے ۱۹۱۰ء میں کوپن ہیگن میں منعقد ہونے والے بین الاقوامی سوشلسٹ اجلاس میں عورتوں کا عالمی دن منانے کا فیصلہ کیا گیا۔ اجلاس میں شامل ۱۷ ممالک کی ۱۰۰ سے زائد خواتین نے اس تجویز کا خیر مقدم کیا۔ اس اجلاس میں کیے گئے فیصلے کی بدولت ۱۷ مارچ ۱۹۱۱ء کو آسٹریا، جرمنی، ڈنمارک اور سوئٹزرلینڈ میں عورتوں کا عالمی دن منایا گیا جس میں ۱۰ لاکھ سے زائد افراد نے شرکت کی۔ یورپ کے دیگر حصوں میں ۱۹۱۴ء سے ۸ مارچ کو عورتوں کا عالمی دن منایا گیا۔ ان اجلاسوں میں جنگ کے خلاف نفرت کا اظہار کرتے ہوئے عورتوں کے بنیادی حقوق اور امتیازی سلوک کے خاتمے کے مطالبات پیش کیے گئے۔ عورتوں کو قانونی تحفظ دینے میں اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ۱۹۶۲ء تک منعقد ہونے والے مختلف کنونشن، عورتوں کے سیاسی حقوق، قانونی حقوق، تعلیم و تربیت اور ملازمت تک رسائی جیسے معاملات کا احاطہ کر چکے تھے۔ ۱۹۷۹ء میں پاس ہونے والی سب سے اہم قانونی قرارداد عورتوں کے خلاف ہر قسم کے امتیازی سلوک کے خاتمے کی قرارداد ہے۔ اس کے بعد ۱۹۹۳ء میں عورتوں پر ہونے والے ہمہ قسم کے تشدد کے خلاف اعلامیہ منظور کیا گیا۔"(۸)

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے تک دنیا کے بیش تر ممالک میں خواتین کو حق رائے دہی حاصل ہو چکا تھا۔ اس عرصے میں حقوقِ نسواں کے نمائندہ کئی رسائل کا اجراء ہوا۔ ان رسائل میں خواتین کے ساتھ ہونے والے معاشرتی استحصال کو تواتر کے ساتھ موضوع بنایا گیا۔ "Time and Tide" ایک ایسا ہی میگزین تھا جس نے خواتین کی جدوجہد کو مربوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ورجینیا وولف (Virgina Wolf)، ربیکا ویسٹ (Rebeca West) اور روز میکالے جیسی خواتین اس رسالے کی نمائندہ مصنّفین تھیں۔(۹(

ورجینیا وولف کی کتاب "A Room of Ones Own" اور سیمون ڈی بوا Simon De Beauvoir کی کتاب "The Second Sex" نے ایسے حقائق پیش کیے جو یقیناً نئے، انوکھے اور منفرد تھے۔ ورجینیا وولف نے خواتین کو مردوں کے غلبے سے نکالنے کے لیے سماجی شعور کی ضرورت پر زور دیا۔ اس نے عورت کے تمام تر مسائل پر کھل کر بات کی۔ سیمون ڈی بوا نے روایتی پدرسری اقدار پر یہ کہہ کر کاری ضرب

لگائی کہ "عورت پیدا نہیں ہوتی، بنا دی جاتی ہے۔" بووا کے مطابق معاشرے میں عورت مرد کے درمیان امتیازات فطری سے زیادہ ثقافتی ہیں۔ اس نے عورت کا ثقافتی، نفسیاتی، معاشرتی اور معاشی پہلوئوں سے جائزہ لیا۔

بیسویں صدی کے اوائل تک خواتین قانونی، سماجی اور تعلیمی مساویت کی جنگ لڑ رہی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک نے صنفی افتراق کو نمایاں کرتے ہوئے معاشرے میں خواتین کے کردار اور ان سے روا رکھے جانے والے رویوں کی از سرِ نو تعبیر کی ضرورت پر زور دیا۔ اس عہد کو تانیثیت کا اوائلی عہد کہا جاتا ہے۔ اس ابتدائی عہد میں خواتین نے تعلیم نسواں اور ووٹ کے حق کو سامنے رکھا ہوا تھا۔

۱۹۲۰ء تک ان حقوق کے حصول کے ساتھ تانیثیت کے پہلے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ دوسرے دور میں تانیثیت کا زیادہ تر زور ثقافتی، سیاسی اور سماجی غیر مساویت پر تھا۔ تانیثیت کے دوسرے اور پہلے دور کا اگر موازنہ کیا جائے تو تانیثیت کے دورِ اوّل کی خواتین اسقاطِ حمل کے حقوق کی مخالف تھیں لیکن دوسرے دور کی خواتین نے اس حقوق کا بھی مطالبہ شروع کر دیا۔ اس دور میں امریکہ میں "Women's Liberation Movement" اور "The National Organization for Woman" معرض وجود میں آئی۔ Now کی بیٹی فریڈین اور اس کے ساتھیوں نے ۱۹۶۶ء میں حقوقِ نسواں کی مربوط و منضبط کوششوں کے لیے تشکیل دیا اور تین سو چارٹرڈ ممبرز کے ساتھ بیٹی فریڈین اس کی پہلی صدر قرار پائیں۔

اس تنظیم کی تشکیل کی بنیادی وجہ یہ بتائی گئی کہ:

"To take action to bring women in to full participation in the main stream of American society now, exercising all the privileges and responsibilities there of in truly equal partnership with men."(10)

۱۹۶۳ء میں شائع ہونے والی بیٹی فریڈین کی تصنیف "The Feminine Mystique" جیسی غیر افسانوی کتاب نے مغربی معاشرے کے تانے بانے کو بدل دیا۔ اس کتاب میں بیٹی فریڈین نے خواتین کے اس عقیدے کو ہدفِ تنقید ٹھہرایا جس کے مطابق وہ اپنی شناخت اپنے بچوں اور خاوند میں تلاش کرتی ہیں۔ یہ ایک ایسی سوچ ہے جس سے خواتین کی انفرادی حیثیت ختم ہو جاتی ہے۔ فیمینزم کی دوسری لہر (Second Wave) ۱۹۶۰ء کے اوائل میں شروع ہوئی اور ۱۹۸۰ء کے اواخر تک کارفرما عمل رہی۔

تانیثیت کی تیسری لہر ۱۹۹۰ء کے اوائل میں ہی شروع ہوگئی تھی۔ تیسرے دور کی تانیثیت پسند خواتین نے دوسری لہر (Second Wave) کی راہنما خواتین پر یہ الزام لگایا کہ انہوں نے صرف طبقۂ اشرافیہ کی خواتین کو ہی مد نظر رکھا جب کہ خواتین کے دیگر طبقات کو یکسر نظر انداز کیا گیا۔

Bell Hooks,Cherrie Morga, اور Gloria Anzaldua ایسی خواتین تھیں جو تانیثیتکے دوسرے دور کے ساتھ ساتھ تیسرے دور کا بھی حصہ رہیں۔ ان خواتین نے تانیثیت میں نسلی موضوعات پر گفتگو کی ضرورت پر زور دیا تا کہ دوسرے دور کی کوتاہیوں کو دور کیا جاسکے۔ تانیثیت کا تیسرا دور زیادہ تر درونی فلسفیانہ مباحث پر مشتمل ہے۔ کچھ تانیثیت پسند خواتین کے بقول مرد اور عورت میں بنیادی صنفی اختلافات موجود ہیں جنہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا جب کہ دوسرے گروپ کے مطابق مردوں اور عورتوں میں کوئی پیدائشی اختلافات نہیں ہیں۔ یہ اختلافات صرف اور صرف ثقافتی تشکیلات کے مظہر ہیں۔

Judith Lorber اپنے مضمون "The Social Construction of Gender" میں لکھتی ہیں:

"There fore in its feminist sense, Gender can not mean simply. The Cultural appropriation of biological sexual difference, Sexual difference is itself fundamental.....and scientifically contested ..... Construction. Both"Sex"and gender, are woven of multiple, changed with multifaceted dramatic narratives of domination and struggle"(11)

دور حاضر میں "نو تاریخیت" پس جدید فکر کی ایک اہم تحریک کے طور پر ابھر کر سامنے آئی ہے۔ "نو تاریخیت کی اصطلاح امریکی نقاد اسٹیفن گرین بلاٹ (Stephen green blatt) نے ۱۹۸۰ء میں وضع کی۔ اس کی مشہور تصنیف "Renaissance self fashioning: from more to Shakespeare" میں نو تاریخیت کے مباحث ملتے ہیں۔ البتہ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں بہت سی تصانیف میں متعلقہ رجحان دیکھا جاسکتا ہے۔ نو تاریخیت کی تعریف اگر سادہ الفاظ میں کی جائے تو یہ طریقہ کار ادبی اور غیر ادبی متون کے متوازی مطالعے کا نام ہے۔ جن کا تعلق عام طور پر ایک ہی عہد سے ہوتا ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ نو تاریخیت بظاہر ادبی متون کی اہمیت کو چیلنج کرتی ہے اور ان ادبی متون کی تاریخ جو کہ پس منظر میں ہوتی ہے اور ان کی ادبیت جو کہ سامنے ہوتی ہے، ان کو ایک لحاظ سے ایک ہی درجے پر فائز کرتی ہے اور ایک دوسرے کو سوال زد کرتی ہے۔ ادب اور تاریخ کے

باہم رشتے کے بارے میں صدیوں سے جو تنقیدی رویے چلے آرہے ہے وہ متضاد بھی ہیں اور متخالف بھی۔ اولا ادب تاریخ کا پیدا کردہ ہے اور ادب کا وہی مطالعہ درست اور مناسب ہے جو کہ اس کے سماجی اور تاریخی پس منظر میں کیا جائے۔ دوم یہ کہ ادبی متن ایک نامیاتی کل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو کہ خود مختار اور آزاد ہے۔ ادبی مطالعہ ادبی اصولوں کی مدد سے آزادانہ کرنا چاہیے نہ کہ خارجی یعنی تاریخی (سماجی وسیاسی) اصولوں کی مدد سے۔ ساختیاتی اور پس ساختیاتی رجحانات نے ادب کی معانی آفرینی کے عمل میں ثقافت کے تفاعل کا راستہ ہموار تو کر دیا مگر چوں کہ نوعیت کے لحاظ سے یہ مطالعات Diachronic ہونے کے بجائے یک زمانی (synchronic) تھے جبکہ زد تشکیل کا انحصار محظ متنیت پر تھا۔ چناں چہ نئی تنقید اور رد تشکیل سمیت ان تمام رجحانات کے خلاف جو کہ محض زبان یا محض لسانیت یا محض متنیت پر زور دیتے ہیں، آہستہ آہستہ ایک بغاوت رونما ہوئی اور اس کے نتیجے میں جو نئی طرز فکر سامنے آئی، اس کو نو تاریخیت کا نام دیا گیا ہے۔ یہ پس جدید فکر متن اور ہم متن (co-text) سے ملحقہ مسائل جیسے پدر سری سماج کی ساختیں اور ان کا دوام، نو آبادیات اور نو آبادیاتی فکر، ریاستی طاقت اور اس کی عمل داری وغیرہ پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔

المختصر تانیثیت آغاز میں اگرچہ حقوقِ نسواں کی ایک سادہ سی تحریک تھی لیکن آج ایک فلسفیانہ تھیوری بن چکی ہے جس کا دائرہ کار خواتین کے سماجی، تہذیبی، ذہنی، نفسیاتی، ادبی اور جنسی معاملات تک پھیل چکا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ تانیثیت پسندوں نے اسے ایک وسیع المعانی تھیوری بنا دیا ہے۔ اس اثناء میں آج تانیثی نظریات کو مختلف زاویوں سے برتا جارہا ہے۔ تانیثیت کے یہ سارے فکری رنگ سماجی سطح پر اپنی اہمیت کو انفرادی اور اجتماعی سطح پر تسلیم کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ ادب اور فنونِ لطیفہ میں بھی تانیثیت اپنا ایک مخصوص نقطۂ نظر رکھتی ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب میں دنیا بھر کے تانیثیت پسند شعراء، ادباء اور ناقدین نسائی نقطۂ نظر کی ادبی جہت کو پیش کر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی نسائی شعور کی صدی ہے۔ آج کی عورت ہر میدان میں اپنی شخصیت کو منوا کر روایتی مردانہ سوچ کی نفی کر رہی ہے۔ بے شک صدیوں کی تشکیل شدہ پدر سری اقدار کا فوری تبدیل ہونا ناممکن نظر آتا ہے لیکن اقدار کے ان قلعوں میں ایسی دراڑیں ضرور پڑ چکی ہیں جن سے نسائی شعور کی روشنی پھوٹ رہی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر، ''جدیدیت کے بعد''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص:۱۰۴۔۱۰۵

۲۔ ناصر عباس نیر، ''جدید اور مابعد جدید تنقید''، انجمن ترقی اُردو، کراچی، ۲۰۰۴ء، ص:۲۷۲

3. The Oxford English Dictionary, Oxford University Press, 1975,P:363

4. Humm, Maggie, The Dictionary of Feminist Theory, Coloumbus: Ohio State University Press, 1990,P:278

۵۔ عصمت جمیل، ڈاکٹر، ''اُردو افسانہ اور عورت''، شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء، ص:۱۵

۶۔ کشور ناہید، ''عورت خواب اور خاک کے درمیاں''، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ئ، ص:۲۲

7. Ambreen Slah-ud-din,"Feminism in modern Urdu Poetesses", West Pakistan Urdu Acadmi, Lahore,2005,P:38

8. Ambreen Slah-ud-din, "Feminism in Modern Urdu Poetesses",P:39

9. Margaret Walters, Feminism a very short Introduction,Oxford University Press Karachi,P:P:89

10. Rosaldo Michele2, Forweword to Feminist theory, A critique of Ideology, Edited by:Nonverlo, Keohance, Michele 2 Rasaldo, and Barbara C Gelpi, The University of Chicago Press, Chicago, 1982,P:viii

11. Judith Lorber,"The social construction of gender",In Magazine Feminest Frontier, No.4,P:45